مطبوعات

مجدد الف ثانی کا تصور توحید | تالیف ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (بزبان انگریزی)۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب۔ کشمیری بازار، لاہور۔

مسلمانوں میں وحدت وجود کا خیال ابن عربی اور شہاب مقتول (صاحب حکمۃ الاشراق) کی بدولت مقبولِ عام ہوا اور رفتہ رفتہ تصوف، اخلاق، فلسفہ، ادب، شعر، سب پر حاوی ہوگیا، یہاں تک کہ دین و شریعت کے علم و عمل کو بھی اس نے بہت کچھ ماؤف کیا۔ آخر کار اس وبائے عام کے خلاف جہاد کرنے کے لیے دو مردِ خدا اٹھے جنکی کوششوں سے بڑی حد تک اس کا زور ٹوٹا۔ ایک ابن تیمیہ، دوسرے شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ۔ لیکن ابن تیمیہ کا جہاد فی الواقع اتنا کارگر ثابت نہ ہوا جتنا شیخ مجدد کا جہاد۔ کیونکہ ابن تیمیہ کا حملہ خالص علوم شریعت اور استدلال کے ہتھیاروں سے تھا جن سے بچنے کے لیے ارباب تصوف کے پاس یہ حیلہ موجود تھا کہ تم اس کوچہ کے آدمی ہی نہیں ہو۔ بخلاف اسکے شیخ مجدد خود اس کوچہ ہی کے آدمی تھے، اور معمولی آدمی نہیں بلکہ شہسوار تھے۔ انہوں نے خود تصوف ہی کے ہتھیاروں سے اس عقیدہ کی خبر لی اور ایسی خبر لی کہ تسمہ تک لگا نہ چھوڑا۔ ارباب تصوف کہتے تھے کہ ہم کشف و شہود کی باطنی حس سے حقیقت کا مشاہدہ کرنے گئے اور ہم نے یہ پایا کہ خالق و مخلوق، عبد و معبود، دو جداگانہ وجود نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہیں، یعنی خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ۔ شیخ مجدد نے جواب میں پورے زور کے ساتھ کہا کہ میں خود یہی باطنی حس لے کر مشاہدہ کرنے گیا تھا، اور جہاں تک تم پہنچے اس سے آگے پہنچ کر میں نے یہ پایا کہ حقیقت براہ راست ہمارے علم و ادراک کے احاطہ میں نہیں آسکتی، ہمارے لیے اسکے سوا چارہ نہیں کہ نبی کے اعتماد پر بس ایمان

بالغیب لے آئیں، اس کو معلوم کرنے کی کوشش سرے سے غلط ہے، دراصل وہ معلوم کرنے کی چیز ہی نہیں ہے، صرف ایمان لانے کی چیز ہے۔ تم جن مقامات سے گذرے وہ سلوک کی ادنیٰ منزلیں ہیں۔ وہاں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہے اور اُس ایک کے سوا کچھ موجود نہیں، مگر یہ صرف وحدت شہود ہے (یعنی ایسا نظر آتا ہے) وحدتِ وجود نہیں ہے (یعنی فی الواقع ایسا نہیں ہے)۔ ان بیچ کی منزلوں میں جو واردات سالک پر گذرتے ہیں، ان پر اعتماد کرنا غلطی ہے، اسلیے کہ اس راہ کا بے خطا اور بے امکانِ خطا علم اگر کسی کو ملا ہے تو وہ صرف صاحبِ وحی کو ملا ہے۔ پس صاحبِ وحی کا علم اصلی معیار ہے اور سالک کے لیے لازم ہے کہ منازلِ سلوک میں سے ہر منزل پر جو کچھ اُسے محسوس ہو اُسکو اس معیار پر جانچ کر دیکھے، اسکے مطابق ہو تو سمجھے کہ صحیح ہے اور اس سے مختلف ہو تو نظر کا دھوکا سمجھ کر رد کر دے۔ ورنہ اگر علمِ وحی کے اتباع سے آزاد ہو کر خود اپنے مشاہدے پر اعتماد کرے گا تو غلطی کرے گا، اور اگر اپنے مشاہدات کی روشنی میں وحی کی تاویل کرے گا تو اس سے بھی عظیم تر غلطی کرے گا ــــ شیخ مجدّد نے اس خیال کا صرف اظہار ہی نہیں کیا بلکہ وحدت الوجود کے خلاف پیہم تبلیغ کر کے اسکے اثرات کو مٹانے کی زبردست کوشش کی اور اُن کا یہ کارنامہ اُن بڑے کارناموں میں سے ایک ہے جن کی بدولت انہیں مجدد الفِ ثانی کا لقب دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر برہان احمد صاحب نے اس کتاب میں شیخ کے اسی کارنامہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے ابتدا میں مجدّد صاحب کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش کر کے انکی شخصیت سے ناظرین کا تعارف کرایا ہے۔ پھر پوری تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ فلسفیانہ (یا خیالی و نظری) توحید اور مذہبی توحید کے مبدأ، غایت، مقتضیات، لوازم، اور نوعیت میں بنیادی فرق کیا ہے اور نہایت تشفی بخش دلائل سے ثابت کیا ہے کہ صوفیۂ وجودیہ کی اصلی غلطی، جسکی وجہ سے وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے یہ تھی کہ انہوں نے فلسفیانہ توحید اور مذہبی توحید کے اصولی فرق کو نظر انداز کر کے دونوں کو عجیب طرح خلط ملط کر دیا۔ یہ بحث دراصل اس

کتاب کی جان ہے اور اس سے جس خوبی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ مستحق داد ہے۔ اسکے بعد انہوں نے ابن عربی کی نیم فلسفیانہ و نیم مذہبی توحید کی تشریح کی ہے اور پھر مجدد صاحب کے ان دلائل کو پیش کیا ہے جن سے وہ ابن عربی کی تردید اور اپنے تصور توحید کا اثبات کرتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے ان بحثوں کا خلاصہ دیا ہے جو مجدد صاحب کے بعد ایک مدت تک ہندوستان میں ابن عربی کے حامیوں اور مجدد صاحب کے پیرووں کے درمیان برپا رہیں اور انکے درمیان محاکمہ کرکے ثابت کیا ہے کہ اسلام کی اصلی توحید وہی ہے جسے شیخ مجدد نے فلسفیانہ تصوف کے ظلمات سے نکال کر از سر نو نمایاں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس مقالہ پر علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے اور حق یہ ہے کہ ان کا یہ کام اس اعتراف کا پورا مستحق تھا۔

انسانی کام کوتاہیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی چند کوتاہیاں ہیں۔

صفحہ ۵۰ سے ۵۲ تک ڈاکٹر صاحب نے مذہبی شعور کے مبدار کی جو تشریح کی ہے اسکو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا مذہب میں خدا اور اسکی صفات کا جو تصور ہے وہ اُس طلب سے پیدا ہوا ہے جو مشکلات اور مزاحمتوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے آپ کو ضعیف و بے چارہ پاکر ایک خدا، اور ایسے ایک خدا کے لیے انسان کے اندر فطری طور پر ابھرتی ہے۔ حالانکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان کے اندر صرف طلب ہی طلب ہے، مطلوب کا کوئی صحیح اور متعین تصور مجرد اس طلب سے پیدا نہیں ہوتا۔ مطلوب کون ہے اور کیسا ہے ("ہونا چاہیے" نہیں بلکہ "ہے") یہ بات خود مطلوب کی طرف سے آئے ہوئے نبی بتاتے ہیں اور انسان کی اسی اندرونی طلب سے اپیل کرتے ہیں کہ جسے تو ڈھونڈ رہی تھی وہ یہ ہے۔ اگر نبی کے بغیر انسان خود اپنی اندرونی طلب کے اشاروں سے اُس کا سراغ لگائے تو کبھی اسکی ذات و صفات کے متعلق ایسے صحیح اور مکمل تصور تک نہیں پہنچ سکتا، اور واقعہ یہ ہے کہ کبھی نہیں پہنچ سکا، کیونکہ اندرونی طلب کے اشارے بہت خفی ہیں، استدلال کے پاؤں کمزور ہیں، اور ہوائے نفس کا رہزن

ہر وقت راہ مارنے کے لیے مستعد ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا مافی الضمیر وہ نہیں ہے جیسا اِس مقام پر اُنکی بحث سے ظاہر ہوتا ہے، مگر انکے بیان کا انداز ایسا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔ بہتر ہو کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ایک نوٹ لکھ کر اس غلط فہمی کا سدّ باب کر دیں۔

صفحہ ۹ اور صفحہ ۱۰ کے حاشیوں میں انہوں نے چند اصطلاحات کی تشریح میں غلطی کی ہے۔ اجماع کو انہوں نے اسلام کا تیسرا ماخذ بتایا ہے۔ حالانکہ اول تو اجماع دراصل اسلام کا نہیں بلکہ احکام شریعت کا ایک ماخذ ہے، اور پھر وہ مستقل بالذات ماخذ نہیں بلکہ تابع کتاب و سنت ہے۔ چونکہ تمام مسلمان مل کر بھی شارع نہیں بن سکتے، اسلیے مسلمانوں کا مجرد کسی امر پر اتفاق اُس کو شریعت نہیں بنا دیتا، بلکہ شریعت میں حجت صرف وہ اجماع ہے جسکی اصل کتاب و سنت میں پائی جاتی ہو۔ تقلید کی تعریف میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "کسی خاص امام کے اجماع اور قیاس کو بجائے قرآن و حدیث کے ماخذِ اسلام ماننا تقلید ہے"۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ تقلید کی صحیح تعریف "کسی امام کے اجتہاد و استنباط پر اعتماد کرنا اور خود براہِ راست کتاب و سنت سے احکام اخذ نہ کرنا" ہے۔ غیر مقلد کی تعریف ڈاکٹر صاحب نے یہ کی ہے کہ غیر مقلد وہ ہے جو اجماع اور قیاس کو ماخذ اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۱۴ کے حاشیہ میں "در اطیعوا الرسول خجالتہا دارم" کا ترجمہ مصنف نے یہ کیا ہے کہ "میں اطیعوا الرسول سے غفلت کرنے پر شرمسار ہوں"۔ حالانکہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ "مجھے اطیعوا الرسول ہی میں شرمندگیاں لاحق ہوتی ہیں"۔

صفحہ ۲۰ پر ڈاکٹر صاحب نے "اسلامی بادشاہی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ایسی ہی متضاد ترکیب ہے جیسے "سفید سیاہی"۔ اسلام تو صرف ایک بادشاہ کو جانتا ہے جس کا نام اللہ ہے۔ کسی دوسرے کی بادشاہی اسے تسلیم ہی نہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

قستمت رجال بالملوك سفاهة ولا ملك الا للذی خلق الملكا

یعنی آدمیوں نے کم ظرفی و نادانی سے اپنے آپ کو بادشاہ کہا حالانکہ دراصل بادشاہی اسی کی ہے جس نے ملک کو پیدا کیا۔

صفحہ ۲۹ پر ڈاکٹر صاحب نے نبوت کو انگریزی لفظ "پرافیسی" کا ہم معنی بتایا ہے۔ حالانکہ دونوں کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ نبوت کے لغوی معنی خبر دینے کے ہیں اور اصطلاحاً نبوت کا مفہوم غیب کی اطلاع دینا ہے۔ بخلاف اسکے پرافیسی کا مفہوم آئندہ کی خبر دینا یا پیش گوئی کرنا ہے۔ عیسائی اور یہودی بیچارے اپنے ذھن کی تنگی کے سبب سے پیش گوئی ہی کو بڑا کام سمجھتے تھے اور اس سے بالاتر نبوت کے کسی مفہوم سے آشنا نہ تھے اسلیے انہوں نے کاہنوں کو نبی اور نبیوں کو کاہن سمجھا اور وہی "پرافٹ" کا لفظ انبیاء کے لیے استعمال کیا جو کاہنوں پر صادق آتا تھا۔

صفحہ ۳۴ پر لفظ سنت کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے "عادت" کیا ہے اور اصطلاحی مفہوم "نبی صلعم کے عادی افعال" بتایا ہے۔ حالانکہ سنت کا صحیح ترجمہ "طریقہ" ہے اور اصطلاحاً اس سے مراد نبی صلعم کا وہ طرز زندگی ہے جو اتباع کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

صفحہ ۳۹ و ۴۰ پر ڈاکٹر صاحب نے سرسید اور مولوی عبداللہ چکڑالوی کے متعلق جو نوٹ لکھے ہیں وہ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اول تو ان دونوں حضرات کا ذکر مجدد صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کے سلسلہ میں لانا یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ گویا یہ بھی اسی سلسلہ کے آدمی ہیں۔ وشتان مابین ھٰؤلاء وھٰؤلاء۔ پھر سرسید کے کام کو "اصلاح" اور "تنقید عالی" کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ "مسلمانوں میں انکے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی و تعلیمی تحریکیں اٹھیں ان سب کا سر رشتہ کسی نہ کسی طرح اُن سے ملتا ہے"، دراصل مبالغہ کی حد سے بھی بہت متجاوز ہے۔ علی گڑھ کے تعلق کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو خواہ سرسید سے کتنی ہی ارادت ہو، مگر جب وہ ایک مسلمان محقق کی حیثیت سے سامنے آرہے ہیں تو انہیں بے لاگ حق کا اظہار کرنا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ

۷ھ کے بعد سے ابتک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہیں ان سب کا شجرۂ نسب با واسطہ یا بلا واسطہ سر سید کی ذات تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سرزمین میں تجدد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ رہے مولوی عبداللہ چکڑالوی تو ان کو "قرآن کا بڑا عالم" کہنا قرآن پر ظلم ہے۔ ایک بہکا ہوا آدمی جسکے ذہن کا توازن بگڑا ہوا ہو علم قرآن کی دولت سے کچھ بھی بہرہ نہیں پا سکتا۔

صفحہ ۸۰ پر مصنف نے صاحب حکمۃ الاشراق کا نام شیخ شہاب الدین سہروردی لکھا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید یہ وہی طریقۂ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ حالانکہ وہ شہاب الدین سہروردی اور ہیں۔ اس التباس کو دور کر دینا مناسب ہے۔

صفحہ ۱۳۵ پر مصنف نے قل الروح من امر ربی کا مطلب، عام غلط فہمی کے اتباع میں "روح امر رب ہے" بتایا ہے۔ حالانکہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ روح خود امر رب ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ "روح امر رب سے ہے" لفظ مِن کو نظر انداز کر دینے سے مفہوم کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ فلسفیانہ تصوف کے مارے ہوئے لوگ تو اصل میں اردو خواں ہیں۔ ان مارگزیدوں کو انگریزی تریاق کیا کام دیگا۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں شائع کیا جائے۔

اسلام کا اقتصادی نظام | تالیف مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات۔ قیمت عہ ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ۔ دہلی۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اس کتاب میں اسلام کے معاشی احکام و قوانین کو ایک نظام کی شکل میں مدون کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانا چاہا ہے کہ یہ نظام کس طرح دنیا کے موجودہ معاشی مسائل کا ایک صحیح و متوازن حل پیش کرتا ہے اور کن وجوہ سے دوسرے نظامات معیشت کے مقابلہ میں لائق ترجیح ہے۔ انکی یہ کوشش اس لحاظ سے ضرور قابل قدر ہے کہ

انہوں نے معاشی معاملات کے متعلق قرآن، حدیث اور فقہی کتابوں میں سے کافی مواد جمع کر دیا ہے جو بجائے خود نہایت مفید ہے لیکن اپنی تصنیف کا جو مقصد انہوں نے بیان کیا ہے اُسکے لحاظ سے ہم اسکو ایک ناکام کوشش کہنے پر مجبور ہیں۔ علم المعیشت سے انکی فنی واقفیت محض سرسری نوعیت کی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے فراہم کردہ مواد کو سائنٹفک طریقہ پر مرتب کرنیکے بجائے عجیب طریقہ سے بکھیر دیا ہے جس سے اسلامی نظام معیشت کا کوئی واضح نقشہ ذھن میں نہیں بنتا۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ اشتراکیوں کو راضی کرنے کی ایک تبلیغی کوشش ہے پھر جہاں انہوں نے دوسرے معاشی نظاموں سے اسلامی نظام کا تقابل کیا ہے وہاں تو انکی ناواقفیت بُری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ فاشزم اور مارکسزم دونوں کے متعلق انکی معلومات نہایت ناقص بلکہ غلط ہیں۔ اور اسی ناقص علم کی وجہ سے انہوں نے بے تکلف یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ فاشزم کی بہ نسبت مارکسزم اسلام سے اقرب ہے، حالانکہ دونوں اسلام سے یکساں دور ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے جسقدر لعنت کے قابل فاشزم ہے اسی قدر مارکسزم بھی ہے۔

کتاب کا سب سے زیادہ افسوسناک حصہ وہ ہے جہاں ہندوستان کے موجودہ حالات پر مصنف نے اپنے نظریات کو منطبق کرنیکی کوشش کی ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے تو وہ حاضر الوقت معاشی نظام میں انقلاب کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں کہ یہ انقلاب دو نظریوں میں سے کسی ایک نظریہ ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ ایک خالص اسلامی نظریہ۔ دوسرا وہ نظریہ جو اسلامی نظریہ کے اصولوں سے قریب تر ہو (یعنی اشتراکی نظریہ)۔ اور آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"بلا خوف و مۃ لائم اسلامی بصیرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس ملک میں سردست پہلا نظریہ جامۂ عمل نہیں پہن سکتا بلکہ دوسرا نظریہ ہی ممکن الوقوع ہے"

۲۳۲ صفحہ کی بحث کے بعد یہ نتیجہ جس پر ہر لائم کی ملامت سے بے خوف ہو کر جناب مولانا پہنچے ہیں، انکی اُس تمام محنت پر پانی پھیر دیتا ہے جو انہوں نے اسلامی نظام معیشت کی خوبیاں بیان کرنے میں صرف فرمائی ہے۔ جو چیز "سردست" جامۂ عمل پہن ہی نہیں سکتی، بہتر تھا کہ سردست اُسکی شرح و تفسیر میں بھی وقت ضائع نہ کیا جاتا۔ پھر وہ اشتراکیت جسکو وہ اپنی "عجیب و غریب اسلامی بصیرت" کی بنا پر اسلامی نظریہ سے قریب تر سمجھ رہے ہیں، اپنے چند ظاہری

پہلوؤں میں اسلام سے کچھ قریب ہو تو ہو، مگر اسکی فلسفیانہ بنیاد، اسکی اخلاقی روح، اسکا نظریۂ حیات، اور اس کا تجویز کردہ نظام اجتماعی تو اسلام سے اتنا ہی دور ہے جتنا موجودہ سرمایہ داری نظام۔ اُسکو اسلام سے قریب وہی سمجھ سکتا ہے جو اُسکو نہ جانتا ہو یا سرے سے اسلامی بصیرت ہی نہ رکھتا ہو۔ اس کافرانہ نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے لیے جناب مولانا نے چند مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی تحفظات تجویز کیے ہیں، حالانکہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کے تحفظات کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ نہیں ہے، اور ایسے تحفظات کی فکر صرف وہی لوگ کرتے ہیں جنکی کم ہمتی پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ ہمیں بہر حال رہنا دوسروں ہی کی عمارت میں ہے، اپنی عمارت کبھی نہیں بنانی۔ صاف اور سیدھی بات، جس کو خوشنما الفاظ کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے، دراصل یہ ہے کہ علمائے کرام کے جس گروہ سے مولانا کا تعلق ہے اُس پر نااہلی کے ساتھ کم ہمتی اور شکست خوردگی کا تسلط ہو گیا ہے۔ اِن لوگوں میں خود اپنے بل بوتے پر کوئی اسلامی تحریک اٹھانے کی ہمت اور صلاحیت نہیں ہے، اس لیے کبھی اشتراکیوں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے ہمسایہ کی پامردی سے بہشت میں پہنچنا چاہتے ہیں۔ لیکن اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے لوگوں کو یقین یہ دلاتے ہیں کہ قصور ہمارا نہیں ہے، یہ اسلامی نظریہ ہی کم بخت ایسا ہے کہ "سردست" اِس کا جامۂ عمل پہننا محال ہے۔ سوال یہ ہے کہ "سردست" اشتراکی نظریہ کا جامۂ عمل پہننا کیوں ممکن الوقوع ہو گیا ہے؟ کیا اسکی کوئی وجہ آپ اِسکے سوا بتا سکتے ہیں کہ اس نظریہ کے حامی آپ سے زیادہ لائق اور آپ سے زیادہ باہمت ہیں؟ وہ انقلاب برپا کرنے کا فن جانتے ہیں اور آپ نہیں جانتے۔ اُن میں یہ جرأت ہے کہ جہاں سرمایہ داری نظام پوری طاقت کے ساتھ مسلط ہے وہاں کھڑے ہو کر اپنے نظریہ کے مطابق انقلابی جدوجہد شروع کردیں، اور آپ میں یہ جرأت نہیں ہے۔ اگر اس کے سوا اشتراکی انقلاب کے ممکن الوقوع ہونے کا کوئی اور سبب ہے تو ہم چیلنج کرتے ہیں کہ اسکو بیان کیا جائے۔ لیکن اگر اصل وجہ یہی ہے تو پھر "سردست" کی آڑ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ صاف اقرار کیجیے کہ اسلامی نظریہ کا جامۂ عمل پہننا کسی وقت بھی ممکن نہیں، کیونکہ جس نظریہ کے پیرو محض نظری حیثیت سے اُس پر ایمان رکھتے ہوں، مگر نہ کارداں ہوں نہ صاحبِ عزم، وہ نظریہ کبھی قیامت تک دنیا میں جامۂ عمل نہیں پہن سکتا۔

اپنی کمزوری کو چھپانا تو خیر اخلاقی کمزوری کی تعریف میں آتا ہے، مگر جب انسان باطل کو حق اور حق کو باطل

ثابت کرنے کی کوشش پر اُتر آئے تو یہ چیز کمزوری سے بڑھ کر جرم کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"ہمیں پاس اس یقین کے لیے روز روشن کی طرح دلائل و شواہد موجود ہیں کہ آج سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والی طاقت اس طرزِ عمل سے بہت خوش ہے بلکہ اسکی متمنی ہے کہ اسلام کے مقدس نام پر پہلے نظریہ کو آج کے ماحول میں زیادہ سے زیادہ معرض تحریر و تقریر میں لایا جائے اور قول و گفتار کا کوئی گوشہ اس سے نہیں چھوڑا جائے، کیونکہ اس کو یہ یقین ہے کہ یہ کلمۃ حق ارید بہ الباطل کا وہ بے نظیر مظاہرہ ہے جو اسکے جابرانہ نظام کے استحکام کے لیے از بس مفید ہے۔ اور اسکے برعکس دوسرے نظریہ کی معمولی سی حرکتِ انقلاب پر زیادہ سے زیادہ تشدد پر آمادہ ہو جاتی اور اسکو فنا کرنے اور قائم نہ ہونے دینے کے لیے مختلف ناموں سے ظالمانہ انداز کے ساتھ مصروفِ عمل نظر آتی ہے، اسلیے کہ وہ خوب واقف ہے کہ اُسکے نظام کی تباہی کا عملی راستہ بحالات موجودہ یہی اور صرف یہی ہے"۔

اس عبارت کا ایک ایک لفظ عبرتناک ہے۔ استدلال کی صورت یہ ہے کہ اسلامی نظریہ کا اعلان و اظہار انگریز کو پسند ہے اور اسکے اقتدار کی جڑ مضبوط کرتا ہے، اور اشتراکی نظریہ ایک کارگر انقلابی طاقت حاصل کر چکا ہے اور انگریز اُس سے ڈرتا ہے، لہذا جو اسلامی نظریہ کے لیے کام کرے وہ برسرِ باطل اور جو اشتراکی نظریہ کی حمایت کرے وہ برسرِ حق! نعوذ باللہ من ذالک۔ اگر اسی کا نام دیانت ہے، تو ایسی دیانت کو دور سے سلام۔ اِن لوگوں نے انگریز کی دشمنی کو ایک مستقل دین بنا لیا ہے اور اسی دین کے معیار پر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اول تو یہ خود عصبیت جاہلیہ ہے۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے اسکو جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ استدلال ایک مسلمان کے لیے کچھ کم شرمناک نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اشتراکیت ہمارے علماء کی مردانگی و قابلیت سے ایک کارگر طاقت نہیں بنی ہے بلکہ اشتراکی ملاحدہ کی قابلیت و مردانگی سے بنی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والی طاقت اُس سے اسی لیے ڈرتی ہے کہ وہ ایک طاقت بن چکی ہے۔ بخلاف اسکے اسلام سے وہ اسلیے بے خوف ہے کہ اسکو کوئی طاقت اسلام کی پشت پر نظر نہیں آتی حتٰی کہ وہ موجودہ حالات میں اسلام کا نام لینے والوں کی پیٹھ بھی ٹھونکنے سے دریغ نہیں کرتی، کیونکہ وہ دیکھ رہی ہے کہ اِس دین کے پیرو یا تو منافق ہیں یا نالائق اور پست ہمت۔ ورنہ اگر اس کی پشت پر حقیقت میں کوئی کارگر طاقت ہوتی تو شاید آج کوئی سرمایہ

دارانہ نظام رکھنے والی طاقت" اُس سے بہت کیا، ذرہ برابر بھی خوش نہ ہوتی، بلکہ" اس کی معمولی سی حرکت انقلاب پر زیادہ سے زیادہ تشدد پر اتر آتی" پس دراصل یہ صورت حال جسکو مولانا صاحب نے دلیل میں پیش فرمایا ہے، اُنکے طرز عمل کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ اُن کے لیے اور ہر مسلمان کے لیے شرم سے ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اللہ اللہ! اسلام ہمارے اور انکے جیتے جی اس حد کو پہنچ گیا کہ اب شیطان اُس سے خوش ہونے لگا!

کانفیڈریسی آف انڈیا مصنفہ "ایک پنجابی"۔ شائع کردہ سر محمد شاہ نواز خان نواب ممدوٹ، ڈیوس روڈ، لاہور

یہ کتاب پاکستانی تحریک کے لٹریچر میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں اس مسئلہ کا علمی اور تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ میں پاکستان کے بجائے "انڈستان" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ پاکستان کے دوسرے نظریات میں اور اس تجویز میں کوئی بنیادی اور اصولی امتیاز نہیں۔ کتاب کا آدھا حصہ اس بحث میں صرف کیا گیا ہے کہ شمالی مغربی ہند کو باقی ہندوستان سے الگ کر کے یہاں ایک خود مختار اسٹیٹ قائم کرنا کس لیے جائز اور واجب ہے۔ اس سلسلہ میں بعض واقعات و حقائق کو نہایت صفائی اور خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ہندوستان کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہاں کی سب سے بڑی اور مقتدر سیاسی جماعت، یعنی آل انڈیا نیشنل کانگریس کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف ناروا بلکہ ناقابل برداشت رہا ہے۔ اس جماعت کا سب سے بڑا منصوبہ اور مقصد یہ رہا ہے اور ہے کہ مسلمانوں کے علحدہ وجود کو فنا کر کے ملک میں ایک متحدہ قومیت کی بنا ڈالی جائے۔ اسی لیے باوجودیکہ کئی بار ہندو مسلم سمجھوتہ ہوا، سیاسی اتحادات قائم ہوئے، مگر بہر حال اکثریت کی قوم نے کبھی ایفائے عہد کی شرم نہ رکھی۔

اس کے بعد مسئلہ قومیت پر ایک تفصیلی بحث کی گئی ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ جب سے مسلمان اس ملک میں آباد ہوئے ہیں آج تک مشترکہ قومیت کی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوئی بلکہ بسا اوقات باہمی تصادم، خانہ جنگی اور خونریزی کا باعث بنی۔ زمانہ حال میں ہندوؤں نے اپنی قومی عصبیت اور اسلام دشمنی کا طرح طرح سے ثبوت دیا ہے۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس، ہندو مہا سبھا، آریہ سماجی تحریک وغیرہ دراصل ایک ہی خواب کی ذرا بدلی ہوئی تعبیریں

ہیں۔ اور یہ خواب کیا ہے؟ یہ خواب ہے ہندوستان میں ہندو قوم کی فرمانروائی۔

اسی سلسلے میں قومیت کے اسلامی اور مغربی تصور کا فرق بتایا گیا ہے اور سمجھایا گیا ہے کہ اسلامی نظریہ کی اساس کن چیزوں پر ہے۔ اسلام اپنا ایک الگ اور مستقل نظامِ حیات رکھتا ہے اس لیے نہ وہ دوسرے نظامات میں جذب ہو سکتا ہے اور نہ ان کے ساتھ تعاون ہی کر سکتا ہے۔

یہ تمام دلائل پیش کرتے ہوئے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ شمالی مغربی ہند کو بقیہ ہندوستان سے کاٹ کر یہاں ایک آزاد حکومت قائم کی جائے چونکہ اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے یہاں "مسلم راج" ہونا چاہیے۔ اسی طرح بنگال اور بعض قریب کے اضلاع کو ملا کر ایک دوسرا وفاق تیار کیا جائے جہاں ایک اور مسلم اسٹیٹ قائم ہو۔ باقی ملک کو راجستان، ہندوستان اور دکن، تین منطقوں یا وفاقوں میں بانٹ دیا جائے اور وہاں "ہندو راج" ہو۔ ان پانچوں وفاقوں میں آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ پھر اگر یہ چاہیں تو آزاد رہیں اور ضرورت سمجھیں تو بعض مشترک اغراض کے لیے ایک تحالف (کانفڈریسی) میں شریک ہو جائیں۔

اس امر کے سمجھانے کی کافی و شافی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان ایک علحدہ قوم ہیں، اُن کا ایک مخصوص اور متمیز تمدن ہے، ایک الگ تاریخ ہے، وہ ایک خاص عقیدے اور روایات کے حامل ہیں، لہذا اُن کی "قومی" زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اُن کا ایک قومی گھر بھی ہو، اپنا ایک الگ اسٹیٹ بھی ہو۔ حُسنِ اتفاق سے "اندستان" میں مسلمان پہلے ہی اکثریت میں ہیں اور یہ تاریخی، نسلی، تمدنی، معاشی اور دوسرے اعتبارات سے ہندوستان کی باقی قوموں سے مختلف بھی ہیں۔ پس ان کی طرف سے اپنی ایک علحدہ سلطنت قائم کرنے کا مطالبہ جائز اور فطری ہے اور ان کی ہیئت اجتماعیہ کے بقا کے لیے یہ ضروری ہے۔

ساری کتاب پڑھ جانے کے بعد چند باتیں خاص طور پر دماغ کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں:

(۱) اول یہ کہ مصنف کی نظر میں ہندوستان کے مسلمانوں جیسے نیک اور معصوم لوگ دنیا میں اور کہیں نہیں بستے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور محبوب بندے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہندوؤں نے ان پر مسلسل اور بے پناہ ظلم

ڈھا رہے ہیں۔ اپنی شماری اکثریت کی بنا پر انگریز کے قائم کردہ نیم جمہوری نظام سے فائدہ اٹھا کر غریب اور بے دست و پا مسلمانوں
کو خوب کچلا ہے۔ اور اب انکے ساتھ رہنا ناقابل برداشت ہے۔ مصنف نے کہیں بھولے سے بھی یہ نہیں لکھا کہ آخر یہ مسلمان
خود اس ملک میں ایک ہزار سال سے کیا کرتے رہے ہیں۔ انکی اخلاقی و معاشرتی زندگی کس سانچے میں ڈھلی۔ انہوں نے
اپنی قوتوں کو کن مقاصد زندگی کے پیچھے صرف کیا۔ انکے سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی تنزل میں انکے اپنے کرتوتوں کا
کتنا دخل ہے۔ انہوں نے اپنی تہذیب اور روایات کو آخر کیوں نہ محفوظ رکھا۔ انگریز اور ہندو کی سیاست سے کیوں دھوکا کھا
گئے۔ اور اگر یہ غلطیاں ہوئیں تو ذمہ دار کون ٹھیرا؟ قابل مصنف نے دور دور کی باتیں تو بہت دیکھی ہیں مگر افسوس کہ
اپنے گھر کا جائزہ نہ لیا کہ یہاں کیسا سامان پڑا ہے، کہاں سے آیا ہے، اسکی کیا قدر و قیمت ہے، اسکا کیا مصرف ہے۔ غیروں
کو کوسنے اور لعنت ملامت کرنے سے حاصل کیا؟ خود اپنا ذہن گندہ ہوتا ہے۔ اپنے ظرف کا پتہ چلتا ہے۔ اپنا نقصان
ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک عظیم الشان خود فریبی ہے جس میں آج ہندی مسلمانوں کا قریب قریب کل علمی طبقہ مبتلا ہے۔ اسی
کتاب میں ایک جگہ تو اسلام کے اعلیٰ آئین اخلاق اور بہترین اصول معاشرت پر فخر کیا گیا ہے اور دوسری جگہ سیکڑوں
صفحوں میں ہندوؤں کو برا بھلا کہا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی توقع ہے کہ ہندو ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور و خوض بھی کریں گے!

(۲) دوسری بات جو ایسی ہی نمایاں ہے، وہ یہ ہے کہ سارا الزام ہندوؤں پر رکھا گیا ہے۔ حکومت کی طرف کہیں ہلکا سا
اشارہ بھی موجود نہیں اور ہے تو بہت مودبانہ انداز میں، جس سے اگر آئے تو وفاداری ہی کی بو آئے شکایت کی جھلک تک نہ ہو
دنیا جانتی ہے کہ انگریزی اقتدار نے اس ملک کے نام نہاد مسلمانوں کے رہے سہے ملی سرمایہ کو بھی کس طرح لوٹ کر برباد کیا اور کس طرح
ہندوستان کی غیر مسلم قوموں سے اشتراک عمل کر کے مسلمانوں کو تاخت و تاراج کیا۔ باوجود اسکے اُس اقتدار اعلیٰ کو بے گناہ اور صرف
اسکے آلۂ کار ہی کو گنہگار ٹھیرانا ایک عجیب بات ہے۔

(۳) تیسری اور بڑی اہم چیز یہ ہے کہ مغربی تصور قومیت کو جھٹلاتے ہوئے خود اسے صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حیرت ہے
کہ فاضل مصنف کو یہ کھلا ہوا تضاد نظر نہ آیا۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ ساری مسلم "قوم" اسوقت اسی دماغی الجھن میں گرفتار ہے
مغرب میں قومیت کی بنیاد نسل، رنگ، زبان، مذہب، معیشت، تمدن، تاریخ، اور جغرافی حدود پر رکھی جاتی ہے۔ انسانوں کی

ایک بڑے گروہ میں جب یہ چیزیں مشترک ہوں تو وہ ایک قوم بنتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ قومیت بنانے کے لیے یہ تمام اجزا موجود ہوں بہر حال انہیں کے متنوع مرکبات سے قوموں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں نے اسی تصورِ قومیت کو لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک ہے، اسکی ایک تاریخ ہے، یہاں کے بسنے والوں کا ایک تمدن ہے، وہ ایک زبان یعنی ہندوستانی بولتے ہیں، وہ یک رنگ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پس ہندوستان کا ہر شخص ہندوستانی قومیت رکھتا ہے عام اس سے کہ اس کا مذہب اسلام ہو یا کچھ اور۔ اسکے جواب میں ہمارے مسلمان بھائی بیک وقت دو مختلف باتیں کہتے ہیں۔ ہندوستانی قومیت کی تردید کرنیکا جب موقع آتا ہے تو کہتے ہیں کہ اسلامی قومیت رنگ، نسل، زبان، وطن وغیرہ سے منزہ ہے اور صرف وحدتِ عقیدہ، وحدتِ مسلک اور وحدتِ مقصد پر قائم ہے۔ بخلاف اسکے جب قومی گھر کا مطالبہ کرنے کی نوبت آتی ہے تو یہ لوگ اسی تصورِ قومیت کو جوں کا توں لے لیتے ہیں جسکو ابھی جھٹلا چکے ہیں۔ اس وقت ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ شمالی مغربی ہند ایک الگ جغرافی خطہ ہے، یہاں کے رہنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں جنکا ایک مذہب ہے، ایک تاریخ ہے، ایک زبان ہے، ایک معاشرت ہے، ایک تمدن ہے، ایک نسل ہے، ایک رنگ ہے، اس لئے یہ اس خطے میں حکومت کرنے کے فطری طور پر حقدار ہیں۔ اُن کا یہ حق تسلیم۔ مگر کوئی یہ سمجھائے کہ پاکستان کے اِس نظریے اور مغربی قوم پرستی میں فرق کیا ہے؟ کہنے کو آپ کہہ لیجیے کہ ہماری قومیت کی بنیاد عقیدے اور ایمان پر ہے۔ لیکن جسطرح ایک ہندو بھگوان پر ایمان رکھتے ہوئے یورپ سے لائی ہوئی وطن پرستی کو اپنا بُت بنا لیتا ہے اسی طرح یہ ہندی مسلمان بھی توحید، رسالت، خلافت، دین اور شرع کے تخیل کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے ہوئے بلا تکلف وہ سب کچھ کر رہے ہیں جسکے خلاف وہ چیخ چیخ کے علمِ جہاد بلند کرتے ہیں۔ ہم سمجھنے سے قطعاً قاصر ہیں کہ پاکستان پرستی کا نظریہ ہندوستان پرستی سے کس حالت میں مختلف ہے۔ یہ بالکل وہی آواز ہے جو ایک نرالے ساز سے نکل رہی ہے ورنہ فرق ذرہ برابر نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نظریہ پاکستان کی بنیاد مسلم نیشنلزم پر ہے۔ جس طرح بنی اسرائیل یہ سوچتے ہیں کہ ایک مرتبہ خدا نے انکو منتخب کر لیا، اب وہ ابدالآباد کیلیے اسکے خاص اور مقبول بندے ہوگئے اور ان

کی ایک مستقل قوم بن گئی، اسی طرح مسلمان بھی یہ سوچنے لگا ہے کہ اسلام اسکو وراثت میں ملا ہے، وہ تمام لوگ جو مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے بہرحال مسلمان ہیں، خواہ وہ کچھ ہی کرتے پھریں، زندگی میں کچھ ہی نظریہ رکھیں، یہاں تک کہ وہ اسلام سے اتنے ہی دور رہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ جتنا کہ ایک ہندو یا عیسائی یا یہودی یا دہریہ ہو سکتا ہے، پھر بھی ماشاءاللہ وہ مسلمان ہی رہتے ہیں اور انکی ہیئت اجتماعی کا نام مسلم قومیت ہی رہتا ہے۔ قومیت کا یہ سراسر جاہلی تصور ہے۔ اسکو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام نطفہ یا وراثت میں کبھی منتقل نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک پارٹی کریڈ ہے۔ اگر ہم اس پر ایمان اور عمل چھوڑ دیں تو آج ہی غیر مسلم ہو جاتے ہیں۔ لہذا پہلی بات یہ ہے کہ اُن تمام انسانوں کو جو مسلمان والدین سے پیدا ہوئے مسلمان قوم فرض کر لینا ہرگز جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر صحیح معنوں میں کوئی اسلامی جماعت موجود ہو تب بھی اس کا کام خدا کی حکومت قائم کرنا ہے نہ کہ "اپنی"۔ اور یہاں یہ عجیب شور و ہنگامہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو حکومت کریں اور پاکستان میں "ہم"۔ پس اگر اس حکومت کو اسلامی حکومت کہا جائے تو یہ صریح دھوکا اور فریب ہے۔

(۴) یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ پاکستان میں ایک جمہوری نظام قائم ہوگا جس میں ہندوؤں، سکھوں اور دوسری اقلیتوں کو پورے پورے تحفظات کے ساتھ شریک فی الحکم کیا جائیگا۔ اسلام کے نزدیک تو یہ مجوزہ نظام ویسا ہی باغیانہ اور کافرانہ ہے جیسا کہ روس، جرمنی اور انگلستان میں ہے۔ اسلام کی تو ہر غیر الٰہی حاکمیت سے مستقل جنگ ہے خواہ وہ حاکمیت کسی ایک شخص یا ایک قوم کی ہو خواہ ہندو یا عیسائی یا مسلمان کی مشترک ہو۔ حتیٰ کہ اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی "اپنی" حکومت قائم کرنا چاہیں تو وہ اسلام سے باغی قرار دیے جائینگے۔ خود اختیاری (سلف ڈٹرمینیشن) کا تخیل ایک جاہلی تخیل ہے۔ دراصل یہ قوم پرستی اور وطن پرستی کا دوسرا نام ہے۔ مسلمان اس تخیل کی جڑ کاٹنے آیا ہے نہ کہ دوسروں کے توڑ پر خود اپنی خود اختیاری کا حق جتانے۔

(۵) فاضل مصنف نے اس امکان کو بھی محفوظ رکھا ہے کہ انگریز کے زیر سایہ رہکر "ہندوستان" میں اسلامی خلافت کس طرح قائم ہو سکتی ہے! اس جہالت یا لاعلمی پر جسقدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ آخر اسلام ہی کا لیبل لگا کے دنیا میں ہر فعل کیوں کیا جائے؟ کس نے مجبور کیا ہے کہ آپ خواہ مخواہ اسلام پر احسان کیجیے؟

اگر یہ جنس مرغوب نہیں تو چھوڑ دیجیے، یہ کوشش کیوں ہو کہ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

(۶) سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم قوموں اور انگریزوں سے تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان میں "مسلم قوم" کی حکمرانی تسلیم کریں۔ اسلامی نظام کا تو ذکر ہی کیا، کسی جاہلی نظام میں بھی یہ قاعدہ معقول اور مسلّم نہیں ہے۔ جو قومیں خود اپنا اقتدار چاہتی ہیں، اجموجہاں بانی کا حوصلہ رکھتی ہیں، وہ حکومت مانگا نہیں کرتیں، لڑ کر اپنی خواہش پوری کرتی ہیں۔

ان صفات کے باوجود کتاب دلچسپ ہے اور غالباً نظریۂ پاکستان کی سب سے اچھی وکالت ہے۔ لیکن دو چیزیں سمجھ میں نہ آئیں۔ ایک یہ کہ کتاب کا انتساب بیک وقت ڈاکٹر اقبال مرحوم اور سر فضل حسین کے نام کیوں کیا گیا ہے۔ آخر ان دو شخصیتوں میں ذہنی یا نظری طور پر کیا چیز مشترک تھی؟ مصنف کو دونوں سے عقیدت ہو یہ اور چیز ہے لیکن اُس کا یہ کہنا کہ ان دو بزرگوں کی خدمات بھی ایک ہی نوعیت کی ہیں واقعی حیرت انگیز ہے۔ دوسری بات یہ کہ مصنف نے کتاب پر اپنا نام نہیں دیا ہے۔ آجکل پاکستان تحریک اور ہندی مسلم سیاست کے متعلق زیادہ تر لٹریچر فرضی ناموں سے شائع ہو رہا ہے۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ لکھنے والے زیادہ تر سرکاری (نوکر) ملازم ہیں۔ قانوناً طور پر مجبور ہیں کہ اپنے نام شائع کریں۔ لیکن وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ وہ اپنی قوم کے دل و دماغ ہیں اور ان کے حوصلہ و جرأت کا حال یہ ہے کہ نام کے اظہار سے بھی ڈرتے ہیں۔ پھر کیا انکی یہ توقع بے سُود نہیں کہ قوم کے عوام ہمت کر کے آگے بڑھینگے اور پاکستان میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دینگے۔